شمس الرّحمٰن فاروقی*

سلیم احمد، تیس سال بعد

مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہم سلیم احمد مرحوم (۱۹۲۷ء۔۱۹۸۳ء) کی تیسویں برسی کے موقع پر انھیں یاد کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ سلیم احمد سے مجھے محبت تھی اور عقیدت بھی۔ اب جب کہ میرے قدیم دوست ممتاز احمد نے سلیم احمد صاحب کو یاد کرنے کا ایک موقع مجھے دیا ہے تو میں اسے شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔

میرے اس مضمون کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ سلیم احمد شاعر کا مرتبہ سلیم احمد نقاد سے بدرجہا بلند ہے۔ اس کے پہلے، میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ سلیم احمد ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کی نظم و نثر نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا۔

سلیم احمد نے ایک بار کہا تھا کہ شاعری میرا کمزور بچہ ہے، لیکن پھر بھی وہ ہاتھی کا بچہ ہے۔ یہ تو کچھ اس طرح کی بات ہے جیسی کہ سلیم احمد نے اپنے مطلعے میں کہی تھی

جس کا انکار بھی انکار نہ سمجھا جائے ہم سے وہ یار طرح دار نہ سمجھا جائے

شاعری کمزور بھی ہے لیکن ہاتھی کے بچے کی طرح عظیم الجثہ بھی ہے۔ اسے انکسار کہیں تو ٹھیک، تعلّی کہیں تو بھی ٹھیک۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے ادبی معاشرے میں تنقید کو ضرورت سے زیادہ، بلکہ بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ بات شاعروں کو پسند نہیں آتی (شاعر بمعنی تخلیقی فن

بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

کار)،لیکن اس شاعر کو اور بھی ناپسند ہوتی ہے جو نقاد بھی ہو۔اس کی تنقید پر لوگ توجہ دیتے ہیں، اس کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں،اس کی زبان سے اپنی تعریف سننے کے متمنی رہتے ہیں،لیکن اس کی شاعری پر توجہ نہیں دیتے۔میں خود اس صورت حال سے دوچار رہا ہوں (بلکہ اس کا شکار رہا ہوں) لہٰذا بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم لوگ کسی کو بیک وقت نقاد اور تخلیقی فن کار تسلیم کرنے سے گریز کرتے رہے ہیں، اور یہ فرض کرتے رہے ہیں کہ اگر تخلیقی فن کار اچھا ہے تو اسے نقاد ہونے کا کوئی حق نہیں (یا کوئی ضرورت نہیں) اور اگر نقاد اچھا ہے تو اس کی تخلیقی سطح یقیناً پست ہوگی۔

یہ تو بہر حال تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں جب سے تنقید شروع ہوئی، ایک حالی کے سوا کوئی نہ ہوا جس کی شاعری بھی اہمیت رکھتی ہو، اور صرف اہمیت نہیں، بلکہ وہ ایسی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو ہمارا ادب نقصان میں رہتا۔ مسدس کوفی الحال ترک کیجیے، چپ کی داد؛ مناجات بیوہ ؛ کی بات کیجیے، اور غزلوں کی بات کیجیے، ان غزلوں کی بھی جو حالی نے اپنے ''جدید'' دور میں کہیں۔ہم نے ان پر بہت توجہ نہ صرف کی ہو، لیکن ہیں وہ اعلیٰ درجے کی شاعری۔انیسویں صدی کی شاعری کا تصور ہم ان کے بغیر نہیں کر سکتے۔افسوس یہی ہے کہ ہم نے نقاد حالی کو سب کچھ سمجھ لیا لیکن شاعر حالی کو کم و بیش نظر انداز کیا۔دوسری بات یہ ہوئی کہ حالی کے بعد جتنے نقادوں نے شاعری لکھی (جدید شعرا کو چھوڑ کر، جن میں سلیم احمد بھی شامل ہیں) ان کی شاعری واجبی ہی واجبی تھی۔لہٰذا یہ مفروضہ اور بھی زور پکڑ گیا کہ نقاد اور شاعر دنیائے ادب میں الگ الگ منصب دار ہیں، ایک کو دوسرے سے لینا دینا نہیں۔میرا خیال ہے سلیم احمد نے اسی مفروضے کو شکست کرنے کی کوشش میں ہاتھی کے بچے والی کہی تھی۔نقد کے جنگل میں وہ ہاتھی بھی رہے اور ان کی شاعری بقیہ تمام صحرائیوں سے بڑھ کر گراں جسم اور قوت مند بھی رہی۔

میں فی الحال یہ بحث نہ چھیڑوں گا کہ جدید زمانے میں (یعنی اس زمانے میں جو حالی اور آزاد سے شروع ہوتا ہے) نقاد نے اس قدر غیر ضروری اہمیت کیوں اختیار کر لی؟ ہماری ادبی تہذیب کا یہ بہت بڑا سوال ہے اور پی ایچ ڈی وغیرہ قسم کی چیزوں کے لئے ان موضوعات سے زیادہ اہم اور بامعنی ہے جن پر ہم آئے دن پی ایچ ڈی وغیرہ ہوتے دیکھتے ہیں۔لیکن میں یہ بات یہاں ضرور کہوں گا

کہ تخلیقی کارگذاری کے مقابلے میں تنقید کی زندگی بہت کم ہوتی ہے۔یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ لوگ ایک شعر، ایک غزل یا نظم، یا ایک افسانے کی بدولت زندہ رہ جاتے ہیں۔اور ہمارے یہاں نقاد کی اس قدر دھونس ہوتے ہوئے بھی کوئی نقاد ایسا نہیں ہوا (محمد حسن عسکری بھی نہیں) جو ایک مضمون نہ سہی، ایک کتاب کے بل بوتے پر زندہ رہ جائے۔یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ آب حیات؛ مقدمۂ شعر و شاعری؛ یادگار غالب؛ کاشف الحقائق؛ موازنۂ انیس و دبیر جیسی کتابیں جو ہماری ادبی تاریخ کا مایۂ ناز حصہ ہیں، ہمیں اب بھی زندہ ادب کی طرح پڑھائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ تو اردو تنقید پر ایک نظر اور اردو شاعری پر ایک نظر بھی کالج اور یونی ورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔بہر حال، ان کو چھوڑ دیجیے تو آج پچاس برس پہلے کی کون سی تنقیدی کتاب ہے جس کا نام لوگوں کو یاد ہو، یہ بات تو الگ رہی کہ اسے پڑھا کتنے لوگوں نے ہے؟

تو کیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سلیم احمد کی شاعری یاد رکھنے کے قابل ہے، اور یہ کہ بطور شاعر ان کا مرتبہ بلند، بہت بلند ہے؟ یقیناً، میں یہی کہتا ہوں۔یہاں ایک نکتے کی بات کہہ دوں پھر آگے بڑھتا ہوں۔شاعری اور افسانہ (یعنی تخلیقی ادب) ایسی چیزیں ہیں کہ ان سے ہزار اختلاف کیا جائے، لیکن اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔لیکن تنقید کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اس سے اختلاف کیا جائے تو تنقید کی نئی راہیں نکلتی ہیں۔اس عمل کے دوران وہ تنقید، جس سے اختلاف کیا گیا تھا، اکثر میدان کے باہر ہو جاتی ہے۔میں تنقید کو سائنس نہیں مانتا اور ''سائنٹفک تنقید'' کی اصطلاح کو بے معنی سمجھتا ہوں۔لیکن ایک نقطۂ نظر سے دیکھیے تو تنقید ایک طرح کی سائنس ہے۔وہ ہزار غیر یقینی اور ہزار غیر متعین سہی، لیکن وہ اس معنی میں سائنس ہے کہ وہ مسترد ہوتی رہتی ہے۔جب تک کوئی سائنسی نظریہ نئے خیالات یا نظریات کی بنا پر مسترد نہیں ہوتا، اسے ہم صحیح مانتے رہتے ہیں۔لیکن جہاں وہ اصول نئے تصورات یا دریافتوں کی بنا پر مسترد ہوا، یا اسے مسترد نہ بھی کیا گیا، لیکن اس سے مدلل اختلاف کیا گیا، وہ سائنس کی دنیا سے عملی طور پر باہر ہو جاتا ہے۔کارل پاپر (Karl Popper) نے اسی بنا پر سائنس کی تعریف یہ کی تھی کہ وہ ''بطلان پذیر'' یعنی falsifiable ہوتی ہے۔دوسرے کچھ بھی کہیں، لیکن میں تنقید کو وقتی اور ہنگامی اہمیت کی کارگذاری سمجھتا ہوں۔(میرا یہ مضمون بھی وقتی اور ہنگامی اہمیت کی کارگذاری ہو سکتا

ہے) خاص کر اگر یہ ثابت ہو جائے کہ تنقید کا معاملہ اگر تخلیقی فن سے ہو تو وہ تخلیقی فن پارہ کبھی مسترد نہ ہوگا، لیکن وہ تنقید مسترد ہو سکتی ہے۔واضح رہے کہ میں ترقی پسندوں کی زیادہ تر تحریروں کو تخلیقی فن پارہ نہیں کہتا۔

لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ سچے تخلیقی فن پارے (خاص کر شاعری) سے آپ کتنا ہی جھگڑیں، اس پر لاکھ اعتراضات لائیں، لیکن وہ قائم رہتا ہے۔تنقید کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دو ہی چار برس میں، اعتراضات کے سامنے ڈھہنے لگتی ہے، یا پھر فیشن، یا "قدامت" کا شکار ہو کر کتب خانوں میں بند ہو جاتی ہے۔

سلیم احمد کی تنقید بے شک اہم ہے، بلکہ ہم میں سے اکثر نے نقاد سلیم احمد کا نام پہلے سنا، شاعر سلیم احمد کا نام بعد میں۔اس میں ان کی تنقید کی کچھ "سنسنی خیزی" کا عنصر بھی شامل رہا ہوگا۔یہ "سنسنی خیزی" اس سے کچھ بہت مختلف نہ تھی جو کلیم الدین احمد صاحب کی تنقید کا خاصہ تھی۔فرق یہ تھا کہ سلیم احمد صاحب کی نثر نہایت شگفتہ، شفاف، اور ظرافت کے عنصر سے بذل وافر رکھتی تھی۔ایسی نثر کہ بس پڑھتے ہی چلے جایئے اور سیری نہ ہو۔لوگوں نے کہا ہے کہ سلیم احمد کی نثر پر عسکری صاحب کا رنگ بہت تھا۔یقیناً ایسا ہے، لیکن عسکری صاحب کا یہ رنگ تو مظفر علی سید، مشفق خواجہ، فضیل جعفری، وارث علوی اور کئی دوسروں کے یہاں بھی ہے۔لیکن سلیم احمد کے یہاں بعض باتیں اور تھیں۔مثلاً وہ اپنے قاری کو دوست سمجھ کر مخاطب ہوتے تھے،اسے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔پرانی اور نئی شاعری دونوں سے انھیں واقفیت تھی اور انس بھی تھا۔وہ کسی شاعر یا شاعری کے ہزار خلاف ہوں، لیکن وہ اس کے حق میں جلاد بن کر نہیں اترتے تھے۔میر کا مصرع (بادنیٰ تصرف) ان کے طور کا نہ تھا۔

یہ طشت ہے یہ تیغ ہے یہ تم ہو کشتنی

سلیم احمد کی تنقید کو بعض لوگوں نے عسکری صاحب کی تنقید سے متاثر بتایا ہے۔یہ بات صحیح نہیں۔سلیم احمد کی چھوٹی سی کتاب غالب کون؟ تو بیشک عسکری صاحب کے خیالات پر مبنی ہے، بلکہ غالب پر عسکری صاحب کے خیالات کی توسیع و توضیح ہے، لیکن نئی نظم اور پورا آدمی جس پر سلیم احمد کی شہرت کی بنیاد قائم ہوئی، عسکری صاحب کے خیالات سے بالکل الگ مسائل اور مباحث کو

چھیڑتی ہے۔عسکری صاحب کسی بھی زمانے میں ترقی پسند نہیں تھے (سیاسی طور پر انھوں نے بعض باتوں میں روس کو امریکہ پر ترجیح دی، لیکن وہ الگ بات ہے)۔نئی نظم اور پورا آدمی میں سلیم احمد نے وہی کام کیا جو ترقی پسند صاحبان کرتے تھے، یعنی وہ ادب سے معاملہ تو کرتے تھے، لیکن غیر ادبی باتوں کی بنیاد پر۔سلیم احمد اور ترقی پسند نقادوں میں یہ بات مشترک ہے، لیکن ان کے تقاضے مشترک نہیں ہیں۔ترقی پسندوں کا تقاضا تھا کہ ادب کو طبقاتی کشمکش کا عملی اور بے دھڑک سپاہی ہونا چاہیے۔ادب کو انقلابی قوتوں (= مارکس موافق قوتوں) کا حامی ہونا چاہیے۔ادب کو سماج اور سیاست میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں کے خلاف سینہ سپر ہونا چاہیے۔ان کی بنیادی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہی ادب اچھا ہے، بلکہ ادب کہلانے کا مستحق ہی وہی ادب ہے جو وہ سب کام کرتا ہو جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ظاہر ہے کہ یہ سب تقاضے غیر ادبی تھے۔

سلیم احمد کا تقاضا یہ تھا کہ ہمارے ادب کو (خاص کر ہماری نظم کو، جس کے باوا آدم حالی اور ایک حد تک سرسید اور محمد حسین آزاد ہیں) انسان کی جنسی جبلتوں کا منکر نہ ہونا چاہیے۔ادب کا، اور بطور خاص ہماری نظم کا اہم ترین کام یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنے بنیادی انسان پن کا شعور سکھائے، اس سے یا اس پر شرمانا نہ سکھائے۔حالی کے زیر اثر ہماری نظم نے خود کو "بہو بیٹیوں" کا اس قدر پابند کر لیا کہ وہ شعرا بھی، جو خود کو حالی سے منحرف قرار دیتے تھے، ان کے یہاں بھی بنیادی انسانی جذبات، اقدار (یعنی جسمانی اقدار) سے ایک طرح کا خوف نظر آتا ہے۔ان کی شاعری کو "پورے آدمی" کی شاعری نہیں کہہ سکتے۔اس کے برخلاف (یہ بات انھوں نے وضاحت سے نہیں کہی، لیکن مخفی طور پر، یا اشاروں میں، کہی ضرور) ہماری قبل جدید شاعری میں "نچلے دھڑ" سے خوف کا کوئی عنصر نہیں ہے۔اسی بات کو انھوں نے اپنے پہلے مجموعے بیاض کے دیباچے میں کہا تھا جس کا میں ابھی ذکر کروں گا۔

اس بات سے قطع نظر، کہ سلیم احمد صاحب نے یہ بات صاف طور پر نہیں کہی کہ وہ شاعری خراب یا کمتر درجے کی ہے، جس میں "پورا آدمی" جلوہ گر نہ ہو، لیکن انھوں نے اس شاعری سے ناطمینانی ضرور ظاہر کی۔لہٰذا ان کا فیصلہ ترقی پسندوں کی طرح جارحانہ تو نہیں، لیکن ان کا طریق کار بھی غیر ادبی ہی تھا۔اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بے مثال نثر، ان کے مطالعے کی وسعت، اور اس سے

زیادہ ان کے انتقالات ذہنی کی چمک دمک نے ہم لوگوں کو اس کا احساس نہ ہونے دیا کہ یہاں بھی فیصلہ جاتی کارروائی ادبی بنیاد پر نہیں قائم ہے۔اختر شیرانی سے لے کر میرا جی، سب ان کے حوالوں کی زد میں ہیں۔شروع ہی میں دیکھیے، راشد کے بارے میں سلیم احمد کیا لکھتے ہیں:

> راشد کا آدمی رومانیت سے کس طرح گتھم گتھا ہے! دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس نظم میں اوپر کا دھڑ نیچے کے دھڑ سے ملنے کے لئے بیتاب ہے تا کہ ایک مکمل وحدت بن جائے۔مگر رومانیت نے اوپر کے دھڑ کو بتا رکھا ہے کہ نیچے کا دھڑ ناپاک ہے،اس کی بات نہیں سننی چاہیے۔وہ گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔[1]

میرا جی کے بارے میں سن لیجیے۔سلیم احمد کو میرا جی سے یک گونہ محبت ہے:

> ''چل چلاؤ''نظم کا موضوع محبت، زندگی،ازل اور ابد پر محیط ہے اور میرا جی اس نظم میں بتاتے ہیں کہ جنسی جذبہ بھی زندگی کی طرح شخصی چیز نہیں ہے...محبت، آدمی،زندگی،سب اسی طرح رواں دواں ہیں، مسافروں کی طرح۔یہ کائنات کا نظام ہے اور پورا آدمی وہ ہے جو کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہوتا ہے...میرا جی نے بیک وقت کسری آدمی اور پورے آدمی کو ایک دوسرے کے تقابل میں رکھ کر دیکھا۔[2]

اس ساری گفتگو میں میرا جی کا شاعرانہ مرتبہ بعض عمومی باتوں اور بڑے دعووں کی بھیڑ میں کہیں دب کر رہ گیا۔''جنسی جذبہ...زندگی کی طرح شخصی چیز نہیں''؛''کائنات کا نظام''؛''پورا آدمی... کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہوتا ہے''۔(زندگی شخصی چیز کس طرح ہے اور جنسی جذبہ شخصی چیز کیوں نہیں؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں۔)''کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہونے'' کا طریقہ سلیم احمد نے نہیں بتایا، بس یہ کہا کہ میرا جی نے''کسری آدمی''اور''پورے آدمی'' کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا۔کس طرح، اس باب میں بھی وہ خاموش ہیں۔ترقی پسند لوگ بھی یہی کرتے تھے، بس ان کے الفاظ کچھ اور ہوتے تھے:''عوامی نظام''؛''طبقاتی کشمکش''؛''تاریخی قوتیں''؛''سرمائے اور محنت کی آپس میں جنگ''؛ ''انقلابی جد و جہد'' وغیرہ۔

تنقید میں یہ طریق کار سلیم احمد نے تا عمر قائم رکھا۔اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اچھے اور برے کا کوئی ایسا معیار نہیں حاصل ہوتا جس کا اطلاق ہم عمومی طور پر تمام تخلیقی ادب پر کر سکیں۔

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس طریق کار میں نقاد کو فنی طور پر اچھے اور برے میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔جوش صاحب پر سلیم احمد نے کئی مضامین لکھے، اور وہاں بھی انھوں نے یہی کیا کہ جوش صاحب کے یہاں''ذہنی کشمکش''اور''تشکیک''وغیرہ دریافت کر کے انھیں اقبال کے مقابل کر دیا اور اس مقابلے میں اقبال پچھڑتے ہوئے نظر آئے:

> ''جواب شکوہ''تعلقات کے نارمل ہو جانے کا اعلان ہے۔اس کے بعد اقبال خدا سے، یا خدا کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ شوخی اور چھیڑ چھاڑ کے ضمن میں آتا ہے۔یہ شوخی اور اور چھیڑ چھاڑ لذیذ ہے اور پر کیف ہے،مگر کسی گہرے باطنی مسئلے کا پتہ نہیں دیتی...اقبال نے جن سوالات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، یا اپنے یقین کی مدد سے برطرف کر دیا، یا چپ چپاتے طور پر اپنے باطن ہی میں طے کر لیا، جوش نے ان سے کھلم کھلا آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی ہے ... میں پاسکل سے، نطشہ سے، اقبال سے خدا کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔یہی وہ مقام ہے جہاں مجھ پر جوش کے کلام کی معنویت کھلتی ہے۔جوش نے میرے سوالات کو اپنی زبان دے دی ہے۔[3]

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بات وہی ہے: میرا جی کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہیں اور جوش صاحب نظام کائنات کے بارے میں کچھ سوال پوچھتے ہیں۔ادبی حسن یا معنویت کا کوئی تعلق اس بحث سے نہیں۔

میں یہاں تک پہنچا ہوں تو تھوڑی سی شوخی بھی کر لینے دیجیے،اللہ میاں کے ساتھ اقبال کی شوخی کی طرح''لذیذ''اور''پر کیف'' نہ سہی۔اسی کتاب کے اگلے صفحے پر سلیم احمد نے جوش صاحب کی رباعی نقل کی ہے۔

ہنسنا بھی عجیب شے ہے رونا بھی عجیب — پانا بھی ہے طرفہ بات کھونا بھی عجیب
اک قادر مطلق کا بہ اوصاف حسن — ہونا بھی عجیب ہے نہ ہونا بھی عجیب

پھر سلیم احمد لکھتے ہیں:

> نفی و اثبات کی یہ کشمکش جوش کے یہاں خارجی طور پر نہیں آئی۔اس کا سراغ ہمیں ان کی گہری باطنی پیکار میں ملتا ہے۔[4]

اس بیان کا کوئی ثبوت نہیں، صرف سلیم احمد صاحب کا دعویٰ ہے۔لیکن جس رباعی کے بارے میں یہ بات کہی جارہی ہے اس کا عالم یہ ہے کہ ہنسنا، رونا، اللہ قادر مطلق کا ہونا، نہ ہونا، یہ سب ایک مرتبے کی چیزیں بتائی گئی ہیں۔اسے عقل کا فقدان کہیں، یا تخیل کی ناکامی، بات ایک ہی ہے۔اللہ میاں کا ہونا یا نہ ہونا شاید جوش صاحب کے یہاں ہنسنے اور رونے کے برابر ہو، لیکن ''اوصاف حسن'' کا فقرہ پھر بھی افسوس ناک ہے کہ اللہ کی صفات کو ''اوصاف'' اور ان صفات کو مربیانہ انداز میں ''حسن'' کہا جارہا ہے۔ہم نے تو یہ سنا ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں فرق کرنا شرک ہے اور یہاں اللہ کی صفات (یا بقول جوش، ''اوصاف'') کو ''حسن'' بتایا جارہا ہے۔اور ظاہر ہے کہ ''اوصاف'' کے ساتھ ''حسن'' کی شرط شاعر نے اس لئے لگائی کہ ''اوصاف'' کے لئے ''حسن'' ہونا شرط نہیں، اوصاف ''قبیح'' بھی ہو سکتے ہیں۔اور اگر اللہ کی ذات اور صفات ایک ہیں تو اگلا قدم آپ خود طے کر لیجیے۔

آخری بات یہ کہ اللہ کے وجود کا یقین ہوجانے (یعنی یہ بات معلوم ہوجانے، کہ اللہ کا وجود ہے) کو ''عجیب'' کہا گیا ہے۔اور اس کے آگے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ بس یہی کہ جوش صاحب کے داخلی واردات کچھ بھی رہے ہوں، لیکن ان کا علم اور قوت فکر دونوں تقریباً بے وجود تھے۔

سلیم احمد کی تنقید پر اتنا وقت اس لیے صرف ہوا کہ ان کی شاعری کو نظر انداز کرنے، ان کی تنقید کے مقابلے میں کم اہم سمجھنے، ان کے اصل ادبی مرتبے سے چشم پوشی کی جو رسم بہت دن سے رائج ہے، اس کے انتزاع کی طرف پہلا قدم میرے خیال میں یہی ہے کہ ہاتھی کے بچے کو پوری طرح عاقل و بالغ اور دشت شعر کے اکثر شیروں پر بھاری قرار دیا جائے۔یعنی یہ مختصر سا مضمون دراصل سلیم احمد کی شاعری کو حقیر سا خراج عقیدت ہے۔

میرا خیال ہے کہ سلیم احمد ہمارے زمانے کے سب سے بڑے غزل گویوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔خود سلیم احمد نے نئی غزل پر بہت کچھ لکھا۔وہ چاہتے تھے کہ نئی غزل کا استقبال کیا جائے، اس کی قدر پہچانی جائے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ، نئی غزل کے بارے میں ان کی کچھ الجھنیں بھی تھیں۔وہ یہاں بھی ''پورے آدمی'' کی جلوہ گری دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے نئی غزل کی تحسین کچھ مشروط اور کچھ متشکک انداز میں کی۔اپنے مضمون ''جدید غزل'' میں انھوں نے لکھا:

> جدید غزل ایک بے کلچر معاشرے کی پیداوار ہے۔ہم اپنا پرانا کلچر گم کر چکے ہیں اور نیا ہم نے ابھی پیدا نہیں کیا۔اس لحاظ سے جدید غزل صرف ایک خلا میں سانس لے رہی ہے۔[۵]

اس بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ جدید غزل صرف ایک خلا میں زندہ ہے۔لیکن سوال دراصل یہ ہے جب سلیم احمد نے غزل لکھی تو اس کے لئے زندہ ہوا کا ماحول خود انھوں نے کہاں سے حاصل کیا؟ اس سوال کا جواب انھوں نے اپنے پہلے مجموعے بیاض کے دیباچے میں ان الفاظ میں دیا:

> گزارش ہے کہ میں نے یہ کتاب ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے لئے نہیں لکھی ہے۔اس کتاب کے پڑھنے والے سے میں جسمانی ہی نہیں، نفسیاتی بلوغت کا بھی مطالبہ کرتا ہوں۔[۶]

''گزارش'' کے نام پر یہ ایک طرح کا منشور ہے، اور اس میں سنسنی خیزی کا وہی رنگ ہے جو نئی نظم اور پورا آدمی میں کم و بیش ہر صفحے پر نظر آتا ہے۔لیکن اس کے پیچھے ایک اہم ادبی منصوبہ بھی تھا۔شاعر کا مقصد اپنے پڑھنے والے کے لیے انقلاب کا مفہوم بیان کرنا نہیں، اور نہ یہ ہے کہ اسے اس بات پر تلقین کی جائے کہ یار، رات بہت لمبی سہی، لیکن صبح کبھی تو آئے گی، سحر جو شب سے عظیم تر ہے، وغیرہ۔شاعر یہ بھی نہیں کہہ رہا ہے کہ میرے کچھ اپنے خیالات ہیں، تجربات ہیں، میری ذات میں کچھ اعماق ہیں، اور میں ان کی ایک جھلک آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔شاعر صرف یہ کہہ رہا کہ میں آپ سے اس قسم کی رومانیت کا مطالبہ نہیں کرتا جو ہر موڑ پر انقلاب کی آہٹ سنتی ہے اور ہر زنداں کے ہر کواڑ کے پیچھے قفل کھلنے کی آواز سنتی ہے، یا سننے کی امید رکھتی ہے۔شاعر یہ بھی نہیں کہتا کہ غزل کی فضا بہت تنگ ہوگئی ہے، میں اپنے لئے تھوڑی سی ہوا مانگتا ہوں، کہ اس میں نئے مضامین اور لفظیات کو لاسکوں۔شاعر نے اپنا مقصود اگلے صفحے پر واضح کیا ہے: میرا کام تو بس یہ ہے کہ جو الفاظ آپ کی غزل میں تھے، اور ہر طرح کارآمد تھے، لیکن اب وہ آپ کی لفظیات سے نکل گئے ہیں یا نکال دیے گئے ہیں، ان الفاظ کو دوبارہ جھاڑ پونچھ کر آپ کے سامنے لے آؤں۔اگلے صفحے پر یہ بیان ہے:

> خود رحمی اور رقت کے جذبات بھی مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں۔یہ عناصر کسی حد تک مجھے بھی اپنے پیش روؤں سے وراثت کے طور پر ملے ہیں، مگر میں نے ان سے شعوری

جنگ کی ہے...رہ گیا بعض ایسے الفاظ کے استعمال کا معاملہ جنھیں اس زمانے کی جعلی مہذب سوسائٹی قبول نہیں کرتی تو اس سے معذرت کیے بغیر مجھے اس بات پر زور دینا ہے کہ اس سوسائٹی کو میر، سودا، نظیر اور آتش کی پوری کلیات کا مطالعہ بجبر [بالجبر] کرانا چاہیے۔[۷]

اس فہرست میں ایک دو شاعر اور ہوتے تو اور بھی اچھا تھا، لیکن سلیم احمد کی بات کو قائم کرنے کے لئے یہ نام کافی تھے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ جدید غزل کے بارے میں بہت سے دعوے بہت سے تقاضے کیے گئے۔ بہت منشور لکھے گئے، یا اعلان عام کیے گئے۔ لیکن سلیم احمد کا محولہ بالا منشور، یا اعلان، جو بھی کہیں، ان سب میں ایک بہت ہی بنیادی امتیاز رکھتا ہے: یہ غزل کے مزاج کے بارے میں اور غزل کی زبان کے بارے میں ہے۔ اس کا اور کوئی ایجنڈا نہیں، اپنے لئے ہم خیال بنانے، اپنی پبلسٹی آپ کرنے کی کوئی کوشش یہاں نہیں ہے۔ ہاں اس منشور پر کچھ لوگ ناک بھوں چڑھا کر شاعر کو اپنی فہرست ملاقاتیان سے خارج کر دیتے، اس کا امکان ضرور تھا۔ لیکن خود شاعر نے اپنے لیے کوئی اپیل نہیں کی ہے۔

یہ سوال غیر ضروری ہے کہ سلیم احمد نے اپنے اعلان نامے پر خود عمل کیا کہ نہیں، اور کس حد تک؟ شاعر سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنے بارے میں جو کہے گا اس پر عمل بھی کر کے دکھائے گا، اسے شاعر کے درجے سے اتار کر لیڈر کے درجے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن اگر ہم سلیم احمد کی غزلیں پڑھیں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں ''معنی خیزی'' کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ جدید غزل پر اپنے مضمون میں، اور دوسری کئی تحریروں میں، سلیم احمد نے جدید غزل کے درجنوں اشعار نمونے یا مثال کے طور پر پیش کیے تھے۔ ان میں چند ہی ایسے ہیں جنھیں سلیم احمد کے طرز کے شعر کہا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم احمد کا طرز غزل گوئی اس زمانے کے اکثر لوگوں سے مختلف تھا، اور جو کچھ وہ اپنے اعلان میں کہہ چکے تھے، اس پر عمل بھی کر رہے تھے۔

سلیم احمد نے روایتی غزل (یعنی وہ غزل جسے حسرت موہانی کے زیر اثر روایتی سمجھا گیا) کے جن پہلوؤں کو ناقابل اقتدا قرار دیا تھا، وہ حسب ذیل تھے: (۱) خود رحمی اور رقت۔ اسے انفعالیت کہہ سکتے ہیں اور یہ وہ کیفیت ہے جو حالی اور حسرت موہانی کے زیر اثر ہمارے یہاں قائم ہوئی تھی۔

(۲) محفوظ، متین، اور شائستہ زبان۔ اسے ''تغزل'' کہہ کر حسرت موہانی وغیرہ نے عام، بلکہ قانون کے طور پر رائج کیا تھا۔ اب اس کی روشنی میں بیاض کی پہلی غزل دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے گفتگو کا لہجہ اختیار کیا ہے، اور اس گفتگو میں ایک طرح کی انانیت اور تلخی اور خود احتسابی بھی ہے۔ یہ انداز اس وقت کی غزل میں ناپید تھا۔

اس غزل کی خوبیوں کی فہرست طویل ہو گی۔ بعض باتیں عرض کرتا ہوں: یہ غزل طویل ہے، مسلسل ہے، بے تکلف گفتگو اور انانیت کا انداز لیے ہوئے ہے۔ بعض نئے اور پرانے شاعروں سے اظہار برأت بھی کرتی ہے، بلکہ ان پر کڑی اور سچی تنقیدی نظر ڈالتی ہے۔ اس میں حکایت با یار گفتن تو ہے، لیکن ''یار'' کی نوعیت کھلتی نہیں۔ وہ ساتھ کام کرنے والا کوئی دوست، ساتھ پڑھنے والا کوئی ہم سبق، کوئی معشوق جس سے بے تکلفی ہے اور جس کے ساتھ عشق کے ''درد'' وغیرہ کا معاملہ نہیں ہے، ان میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔ وہ آج کے زمانے کا دوست/معشوق/سرسری ملاقات والا واقعیت پسند ''پارٹنر'' معلوم ہوتا ہے۔ معشوق کے ساتھ ایسا معاملہ گذشتہ زمانے میں تو کیا، آج بھی ملنا مشکل ہے۔ یہ غزل اپنے وقت (یعنی تاریخی اعتبار سے وقت) سے آگے کی چیز ہے لیکن بعض معاملوں میں پیچھے بھی ہے۔ ہر مصرع برجستہ ہے، دونوں مصرعے پوری طرح مربوط ہیں۔ الفاظ میں باہم مناسبت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کچھ شعرا پر تنقیدی، یا دوستانہ نظر ڈالی گئی ہے اور کوئی نہ کوئی بنیادی بات کہی گئی ہے۔

عشق میں کھو کے عزتِ سادات — میرؔ کی طرح کیوں پھریں ہم خوار
ہم روش پر فراقؔ کی کیوں جائیں — منزلِ غم نہیں ہمارا دیار
ربط رکھتے ہیں گو یگانہؔ سے — ان کا مسلک مگر ہے تیغ کی دھار

اپنے (اور اپنے بہانے سے معشوق کے) بارے میں حق گوئی کے شعر دیکھیے۔

آئینہ کیوں خلوص کو دکھلائیں — اپنے دل میں بھرا ہوا ہے غبار
مفت بن باس لے کے عمر گنوائیں — کوئی ہم رام جی کے ہیں اوتار

اگلے صفحوں میں اسی خوش طبعی لیکن تلخ سچائی کے ساتھ باتیں ہیں۔ دو چار صفحوں کو چھوڑ کر اس غزل کی طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔

حرم کا پوچھنا کیا گھر خدا کا ہے مگر اے دل — وہاں تو سب کے سب ہوں گے مسلماں ہم نہیں جاتے

بلاوے تو بہت آئے مگر شہر نگاراں میں   وہی ہے امتیازِ جان و جاناں،ہم نہیں جاتے
ہمیں دو گز زمیں کو شہر والے منع کیا کرتے   مگر راس آگیا ہے اب بیاباں، ہم نہیں جاتے
بجا انسان کی عظمت، سفر بھی چاند کا برحق   سلیم اس کا برا کیا ماننا، میاں ہم نہیں جاتے

ان اشعار پر مفصل اظہار خیال کے لئے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ فی الحال اتنا ہی کہہ دینا مناسب ہے کہ ایسی غزلوں پر ''غم جاناں'' یا ''غم دوراں'' کے عنوانات نہیں لگ سکتے، نہ ہی ''اظہار ذات'' اور ''داخلی بیان'' کے عنوانات لگ سکتے ہیں۔ یہ غزلیں ان مصنوعی تفریقات وانواع سے ماورا اور بری ہیں۔یہ تفریقات اور انواع بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے اواخر میں وضع کی گئی تھیں اور غزل کی دنیا میں بڑے بڑے انقلاب لانے کا دعویٰ کرنے والوں (مثلاً یگانہ اور فراق) کو بھی ان سے مفر نہ مل سکا تھا۔سلیم احمد کی ان غزلوں کو پڑھیے تو لگتا ہے کہ ذہن وسط بیسویں صدی کا اور شاعری کے آداب، رکھ رکھاؤ، غیر انفعالی لہجے میں تھوڑی سی خوش طبعی کے ساتھ بات کہنے کا انداز، یہ سب انیسویں صدی کے اوائل کا ہے جب ہماری غزل پر درحقیقت بہار تھی۔اور میں صرف غالب کی بات نہیں کررہا ہوں (غالب کا نام سلیم احمد نے اپنے دیباچے میں نہیں لیا تھا، کیونکہ وہ غزل کی لفظیات کی بات کہہ رہے تھے)، میں مصحفی جیسوں کی بات کہہ رہا ہوں جنھیں کسی نے ''امروہہ پن'' پر ٹرکا دیا، کسی نے ''ذاتی رنگ کے فقدان'' کی جھاڑو پھیر دی، کسی نے ''مانوس و معصوم درد اور حسرت''، ''اوپر کے دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبالینے کی ادا'' کا غازہ پھیر کر مشاق اور مضمون آفریں استاد کو نکہائی کے مونڈھے پر بٹھا دیا۔میں دیوان ششم، دیوان ہفتم اور دیوان ہشتم کے مصحفی کی بات کررہا ہوں، ملاحظہ ہو، یہ چند شعر مصحفی کے دیوان ہشتم سے ہیں۔

نقش نہ کبھی صورت نوئی کا مٹے گا   مجار کے ہے ہاتھ میں جب تک کر بسولا
رات دن شہر کی گلیوں میں پڑے پھرتے تھے   عشق تھا جب کہ ہمیں اس بت ہرجائی کا
جرخ صندوقچہ فرنگ کا ہے   آنکھیں کرتی ہیں سیر تصویرات
کھلتا ہے قفل عیش مرا اس سے مصحفی   جس کے ازاربند میں چھوٹی کلید ہے
گر رہوں شہر میں، ہو دود کے باعث خفقاں   جاؤں صحرا کو تو دم گرد بیاباں روکے

ماحولیات سے لے کر فلسفہ اور کائنات سے لے کر بے تکلف جنسی بیان، ان شعروں میں کیا نہیں ہے؟ سلیم احمد نے مصحفی کا آٹھواں دیوان نہیں دیکھا تھا، لیکن جس طرز سخن گوئی کو انھوں نے ہمارے زمانے میں عام کیا، اس کی داد میر اور مصحفی ہی سے مل سکتی تھی۔

چند صفحے اور آگے چلیں تو وہی انداز برقرار ہیں،دل دکھی بہت ہے لیکن ہم ہنسنا جانتے ہیں۔ہم یہ بھی کہہ دیں گے کہ دل دکھی وغیرہ کچھ نہیں ہوتا، یہ سب مصالحہ بھرے سموسے ہیں۔غزل سے لطف اٹھانا سیکھیے، فراق صاحب کی طرح ''منزل غم'' میں نہ رہیے اور حسرت موہانی کی طرح ''چکی کی مشقت'' اور ''مشق سخن'' کو برابر نہ سمجھیے۔

ان کو ٹوٹا ہوا دل ہم بھی دکھائیں گے سلیم   کوئی پوچھ آئے وہ کیا لیتے ہیں بنوائی کا
عہد ناز کو کیا کیا گماں ہیں اور وہ نگاہ   مزاج پوچھ کے چھدا اتارنے والی
الجھتے ہیں وہ ربط باہمی کے ذکر سے اتنے   اسے گویا ریاضی کا کوئی مسئلہ سمجھتے ہیں
سلیم ان سے نہ کہیے گا کبھی موسم نہیں اچھا   کہ ان باتوں کو بھی وہ ہجر کا دکھڑا سمجھتے ہیں

ابھی لطف غزل تھا اور لطف مضمون، کہ جو باتیں ان شعروں میں بیان ہوئی ہیں ان کی بنیاد پرانے ہی مضامین پر ہے۔لیکن بیاض کی آخری غزل میں غالب اور ناسخ کی خیال بندی کو اسی ٹھسے کے ساتھ، لیکن اپنے ہی کو تختۂ مشق بنانے کے لئے باندھا۔یعنی اپنی وقعت پر اکڑنے کے بجائے اپنی حقیقت کا احساس ہے (مصحفی کا پہلا شعر جو میں نے نقل کیا، دوبارہ ملاحظہ کریں)، کہ ہم ساحل شعر اور دریائے علم کے چند صدف جمع کرنے کے سوا کچھ کرتے نہیں ہیں، اور آج یہی بہت ہے۔

جیسے تازہ ہی رہے گی گل مضموں کی بہار   اس تکلف سے ترے رخ کو گلستاں باندھا
ایسے چلتے ہوئے مضموں پہ کیا ناز سخن   قد بالا کو ترے سرو خراماں باندھا
یاد رخ سے نہ گیا جاتے ہوئے وقت کا غم   بہتے پانی پہ عبث نقش گلستاں باندھا
شاخ بے رنگی مطلق سے جسے دل کہیے   چند گل توڑ کے گلدستۂ امکاں باندھا

اپنی لا جواب خوبصورت مگر اختلافی باتوں سے بھری ہوئی کتاب غالب کون میں سلیم احمد نے لکھا تھا کہ غالب کی فارسیت ''احساس کمتری کی پیداوار ہے۔'' غالب کے مشہور شعر

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

پر سلیم احمد نے لکھا:

> پورا شعر مصنوعی ہے۔حساس پڑھنے والا جانتا ہے کہ یہ اکڑ دکھاوے کی ہے۔اس میں مبالغے کی مقدار ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔فارسیت زدگی اس دکھاوے میں مدد دے رہی ہے۔[۸]

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تجریدی اور خیال بندی کے مضامین کے لیے فارسیت ناگزیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اوپر منقولہ غزل کے اشعار میں سلیم احمد کے عام انداز سے زیادہ فارسیت دیکھتے ہیں۔دراصل سلیم احمد کی غزل کی سب سے بڑی قوت یہ تھی کہ وہ مضمون لاتے تھے مگر گرد و پیش سے، اور استعارہ بناتے تھے سامنے کی باتوں سے۔اس فن کو ان کے بعد والوں نے انھیں سے سیکھا۔

اکائی کی غزلوں میں مضمون آفرینی اور استعارہ بندی پہلے ہی جیسی ہے لیکن جوانی کے چونچال پن کی جگہ کچھ افسردگی، کچھ محرومی جھلکنے لگی ہے۔ممکن ہے سلیم احمد کو احساس ہو گیا ہو کہ دنیا اپنا حق لے کر چھوڑتی ہے، انسان کو اپنا غلام بنانے کی کوشش سے کبھی باز نہیں آتی۔

صرف منزل کے تعین سے نہیں چلتا ہے کام ہر سفر کے واسطے رخت سفر بھی چاہیے
تو نے گھر چھوڑا مگر گھر سے تعلق تو نہ توڑ گاہے گاہے وحشتیں کم ہوں تو گھر بھی چاہیے
بعد میں کیا انجام ہوا یہ آگے پڑھنے والے بتائیں اس کی کتاب دلداری کی پہلی جلد تو پوری تھی
میں بے نیاز ہوں محروم مدعا نہ سمجھ کہ ایک دست طلب زیر آستیں ہوں میں

بیاض کی ایک مشہور زمانہ غزل کے کچھ شعر جو مجھے یاد ہیں:

دل حسن کو دان دے رہا ہوں گاہک کو دکان دے رہا ہوں
شاید کوئی بندۂ خدا آئے صحرا میں اذان دے رہا ہوں
حاصل کا حساب ہو رہے گا فی الحال تو جان دے رہا ہوں

اس کے بعد اب اسی طرح کی (یعنی اپنے بارے میں) غزل ''اکائی'' میں دیکھیں۔

تجھ کو صورت سے جانتا ہوں مگر نام کیا ہے یہ بھولتا ہوں میں
جن سے آئینہ بھی گریزاں ہو ایسے چہروں کو دیکھتا ہوں میں

چراغ نیم شب تک پہنچتے پہنچتے روح کی تھکن نمایاں ہو جاتی ہے۔دنیا سے محاربہ اب بھی جاری ہے، نہ ایں راخطر نہ او را ظفر، لیکن روح میں یہ احساس جاگزیں ہو چکا ہے کہ میں رائیگاں سہی، لیکن رائیگاں نہیں ہوں۔میری روح میں کرب ہے اور دل میں غم، یہی میری کائنات ہیں۔میں اب وہ سرکش، گردن افراز سلیم احمد نہیں ہوں جو کہتا تھا۔

نہ پوچھو عقل کی چربی چڑھی ہے اس کی بوٹی پر کسی شے کا اثر ہوتا نہیں کمبخت موٹی پر
محبت کچھ بڑی ہے عمر میں اور ہے ہوس چھوٹی مگر دل ہے کہ ہے سو جان سے لہلوٹ چھوٹی پر

اب یہ سلیم احمد خود کو بے مصرف نہیں، بلکہ اس مسافر کی طرح دیکھتا ہے جس کی کشتی میں سوراخ ہی سوراخ ہوں اور وہ دو سوراخوں کو بند کرنے کے لئے اپنا دامن پھاڑے تو چار دیگر رخنوں کے لئے اسے اپنی پگڑی کی دھجیاں بنانی پڑتی ہیں۔چراغ نیم شب کی ایک غزل میں تمام و کمال نقل کرتا ہوں۔

دلوں میں درد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں جنھیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں
غنیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں
پرانی کشتیاں ہیں میرے ملاحوں کی قسمت میں میں ان کے بادباں سیتا ہوں اور لنگر بناتا ہوں
یہ دھرتی میری ماں ہے اس کی عزت مجھ کو پیاری ہے میں اس کے سر چھپانے کے لیے چادر بناتا ہوں
یہ سوچا ہے کہ اب خانہ بدوشی کر کے دیکھوں گا کوئی آفت ہی آتی ہے اگر میں گھر بناتا ہوں
حریفان فسوں گر مو قلم ہے میرے ہاتھوں میں یہی میرا عصا ہے اس سے میں اژدر بناتا ہوں
مجھے ان سیپیوں کو دیکھ کر یوں ہی خیال آیا یہ پانی سے میں اپنے خون سے گوہر بناتا ہوں
مرے خوابوں پہ جب تیرہ شبی یلغار کرتی ہے میں کرنیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

یہ غزل سلیم احمد کا مرثیہ ہے اور جدید انسان کا بھی۔جس شخص نے سنگ دل حقیقت پرستی اور پنچایتی رائے زنی سے غزل گوئی آغاز کی۔اس نے یہ غزل کہی، ہر طرح مکمل، خوبصورتی میں لاجواب، لیکن محزوں--اپنی محزونی اور دنیا کی بے وقعتی سے بھرپور۔ان کی ایک اور غزل کے دو شعر سنا کر آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے　　　اب ذرا نیچے اتریے آدمی بن جایئے
عالم کثرت نہاں ہے اس اکائی میں سلیم　　　خود میں خود کو جمع کیجے اور کئی بن جایئے

(۲۵ستمبر ۲۰۱۳ء کو اقبال انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ اور شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے اشتراک سے منعقد ہونے والے سیمی نار بیادِ سلیم احمد میں پڑھا گیا۔)

حوالہ جات

٭ اردو کے معروف ادیب، نقاد اور فکشن نگار، نئی دہلی، انڈیا۔

۱۔ سلیم احمد، نئی نظم اور پورا آدمی (کراچی، ۱۹۶۲ء)، ص۴۹۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۹، ۵۰۔

۳۔ سلیم احمد، ادھوری جدیدیت (کراچی، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۴۸، ۱۴۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۵۰۔

۵۔ سلیم احمد، "جدید غزل" مشمولہ فنون جدید غزل نمبر (۱۹۶۹ء)، ص ۳۷۔۲۱۔

۶۔ سلیم احمد، "گزارش"، کلیاتِ سلیم احمد (لاہور: الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۸۔ سلیم احمد، غالب کون (کراچی: مکتبہ المشرق، ۱۹۷۱ء)، ص ۱۳۳۔

مآخذ

احمد، سلیم۔ نئی نظم اور پورا آدمی۔ کراچی، ۱۹۶۲ء۔
_____۔ ادھوری جدیدیت۔ کراچی، ۱۹۷۷ء۔
_____۔ "جدید غزل"۔ مشمولہ فنون جدید غزل نمبر (۱۹۶۷ء): ص ۳۷۔۲۱۔
_____۔ کلیاتِ سلیم احمد۔ لاہور: الحمرا، ۲۰۰۳ء۔
_____۔ غالب کون۔ کراچی: مکتبہ المشرق، ۱۹۷۱ء۔